© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

موجودہ اشتعال انگیز ماحول میں جب کہ جماعت اسلامی کے مخالفین اس کی آواز کو دبانے اور اس کی راہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑے اوچھے ہتھیاروں اور گھٹیا ہتھکنڈوں کے استعمال پر اُتر آئے ہیں، ہم اپنے رفقاء اور بہی خواہوں سے چند باتیں کہنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے جذبات کے اندر توازن پیدا کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو بیکار کاموں میں ضائع کرنے کے بجائے تعمیری کاموں میں لگا سکیں۔

پہلی چیز جس کی طرف ہم اُنہیں بار بار توجہ دلا چکے ہیں اور اب پھر دلا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ مل کر وہ جو کام کر رہے ہیں وہ کوئی "سیاست بازی" نہیں بلکہ سراسر دین کی خدمت ہے۔ جماعت اسلامی اُن معنوں میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے جن معنوں میں آج لفظ "سیاست" بولا جاتا ہے۔ مادی تہذیب کی یلغار نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں سے شرافت، اخلاق، حق پرستی اور انصاف پسندی کو نیست و نابود کیا ہے وہاں اُس نے سیاست کا بھی حُلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اس لفظ کے زبان پر آتے ہی انسان کی توجہ کسی ایسے مذموم اور ناپاک دھندے کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جو صرف چالاکی، عیّاری اور مکر و فریب کے بل پر کیا جاتا ہے اور جس میں خلوص، ایمانداری، ایثار اور للّٰہیت نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ دورِ جدید کے سیاسی کاروبار کو دیکھتے ہوئے سیاست کی یہ تصویر کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں۔ مادّی تہذیب نے اجتماعی زندگی کی ساری غلاظتوں کو اس میدان میں لا کر جمع کر دیا ہے جن کی وجہ سے پوری فضا میں خوفناک قسم کا تعفن پھیل گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اخلاق و شرافت کے قدر دان نہ تو خود اس متعفن فضا کا رخ کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی اس جسارت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ اِس فضا میں پہنچتے ہی اِس کے اَخلاق کُش جراثیم آدمی کے اندر سرایت کر کے اس کے اخلاقی احساسات کو بالکل فنا کر دیں گے۔

یہ سیاسی کاروبار جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اور جس سے آج ہر شخص واقف ہے اس سے جماعت کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ ہم اِس دھندے کو اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل غلط اور اخلاق سوز سمجھتے ہیں، اس سے محفوظ رہنے کے لیے خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ پوری انسانیت کو اس سے نجات حاصل ہو۔ جماعت اسلامی اوّل و آخر دینی جماعت ہے اور دین کے تقاضے کے تحت ہی وہ سیاسی میدان میں اُتری ہے۔ اس بنا پر اس کی سیاست سے دلچسپی اُسی حد تک ہے جس حد تک کہ اللہ کا دین مطالبہ کرتا ہے اور وہ فکر و احساس کے اُس مقدس سرمائے کے ساتھ اس میدان میں سرگرمِ عمل ہے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا زادِ راہ ہوتا ہے۔ ہم جس طرح اس بات کے خواہش مند ہیں کہ انسان کے قلب و دماغ میں ایمان کی شمع فروزاں ہو، اس کی انفرادی زندگی اسلامی اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہو، اس کی معاشرت ہر بُرائی سے پاک ہو، اس کی معیشت ہر قسم کے ناجائز استحصال اور ہر ناانصافی سے محفوظ ہو، بالکل اسی طرح ہم اس بات کے بھی دل و جان سے متمنی ہیں کہ سیاست کے کاروبار سے جھوٹ، مکر و فریب اور ابن الوقتی کی ساری آلائشیں دُور کر کے اُسے خدا خوفی کی بنیاد پر از سرِ نو استوار کیا جائے اور اجتماعی زندگی کا یہ میدان چالاکیوں اور عیاریوں کا ناٹک پیش کرنے کے بجائے شرافت، پاسِ عہد، اصول پرستی اور ایثار کا نقشہ پیش کرے۔ لوگ اس میدان میں اُسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اتریں جس کے ساتھ وہ پانچوں وقت خدا کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔

ہمارے رفقاء کو کسی مرحلے میں بھی عام "سیاست بازی" اور جماعت کی سیاسی جدوجہد کے مابین اس عظیم فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس کام میں کوئی دنیوی فوائد حاصل کرنے یا حکومت پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبضہ کرکے اپنے لیے یا اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے مختلف قسم کی جائز و ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہوئے۔ اِس میدان میں ہماری جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اُس عظیم سرچشمے کو، جو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کرتا ہے، ہر قسم کی غلاظتوں اور آلائشوں سے پاک کیا جائے اور اس سے حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ جو افراد بھی ان غلاظتوں کو دُور کرنے اور تعفن کی اس زہریلی فضا کو پاک کرنے کے لیے عملی طور پر آگے بڑھیں اُن کے لیے نہ صرف یہ بات ضروری ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مقصد کی عظمت کو سامنے رکھیں بلکہ اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اِس مسموم فضا کے ہلاکت خیز اثرات سے خود اپنے آپ کو بچانے کے لیے تمام مؤثر تدابیر اختیار کریں۔ اس سلسلے میں اُن کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے خود اچھی طرح صحت مند ہوں۔ کیونکہ اگر وہ خود ایمان و عمل کے لحاظ سے تندرست و توانا نہ ہوں گے تو وہ مسموم فضا میں پھیلے ہوئے جراثیم کے حملوں کا اچھی طرح مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ ہنگامی حالات میں عملاً یہ مشکل ہوتا ہے کہ جماعت اس کے لیے تربیت گاہیں قائم کرے۔ مگر انھیں خود اپنی تربیت کے فرض سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں وہ تمام تدابیر اختیار کرنی چاہییں جن سے اُن کے ایمان مضبوط اور اعمال صالح ہوں اور ان کے اندر اخلاص اور صبر و ثبات کی قوت پیدا ہو۔ قرآن و حدیث اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ انھیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین کی سیرتوں کا بھی مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔

دوسرے، اس مقدس جدوجہد کی خاطر میدانِ عمل میں اُترتے وقت انھیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ کسی عام دنیوی انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہیں بلکہ اس عظیم روحانی اور اخلاقی انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں جو انبیاء علیہم السلام جیسی عظیم اور مقدس ہستیوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھوں برپا ہوا اور سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد جلیل القدر صلحائے امت جس کے لیے مسلسل تگ و دو کرتے رہے۔ میرے ایک نہایت ہی واجب الاحترام بزرگ، جو اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنی نیکی اور پرہیزگاری کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے، انہوں نے ایک مرتبہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بڑے بے ساختہ انداز میں یہ فقرہ کہا: "دنیا میں اس سے بڑا اعزاز اور اس سے بڑی خوش نصیبی کسی انسان کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے مشن کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" مادہ پرستی کے اس دور میں جب انسانوں کی عظیم اکثریت زندگی کے ہر معاملے کو مادی سود و زیاں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، اگر کچھ لوگ اُخروی فلاح و کامرانی کو زندگی کا اصل مقصود و مطلوب قرار دے کر جد و جہد کریں تو یہ اس گروہ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جس کے لیے اس کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اس وقت جب کہ لوگوں کو دنیوی لذتوں نے بالکل مدہوش کر دیا ہے وہ اس گروہ کو اپنا حریف سمجھ کر اُسے بالکل مٹانے پر تُلے ہوتے ہیں، مگر انہیں اپنے اس فیصلے کی غلطی کا جلد ہی احساس ہو جائے گا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انسانیت کی اخلاقی صحت کے لیے اس گروہ کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے۔

جو شخص جسمانی اعتبار سے علیل ہو وہ خود طبیب کے پاس چل کر آتا ہے اور اس سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ مگر جو لوگ روحانی اور اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اُن کی فکر اس قدر مفلوج ہو جاتی ہے کہ وہ خود اپنے دشمن بن کر اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقیقی بہی خواہوں کو اپنا بدخواہ اور اپنے بدخواہوں کو اپنے بہی خواہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ غور کیجیے کہ وہ لوگ کس قدر بے نفس، صابر اور معتدل مزاج ہوں گے جو ان روحانی اور اخلاقی مریضوں کی صحت کے لیے سرگرمِ عمل ہوں۔ یہ معالج اس انتظار میں نہیں رہتے کہ مریض اُن کی طرف رجوع کریں اور پھر وہ اُن کی صحت کی بحالی کے لیے کوشش کریں، بلکہ یہ بڑی دل سوزی کے ساتھ مریضوں کی طرف لپکتے ہیں اور اُن کی ساری نادانیوں کے باوجود اُن کے اندر سوئی ہوئی شرافت اور خدا خوفی کو بیدار کرکے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں روحانی اعتبار سے صحت مند بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔

پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت ان روحانی اور اخلاقی عوارض میں مبتلا ہے اور ان کے خطرناک نتائج بھی اس کے سامنے کھل کر آ گئے ہیں۔ مگر مادہ پرستی کے اس روگ نے اس کے اندر شعور کو بالکل ختم کر دیا ہے اور اُسے اس امر کا قطعاً احساس نہیں ہو رہا کہ وہ کس قدر سرعت کے ساتھ تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ ان حالات میں انسانوں کا جو گروہ بھی ان عوارض کو دُور کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا اُسے ناقابلِ بیان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔

ہمارے بعض رفقاء ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ مگر انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ساری مشکلات اس راہ کی فطری دشواریاں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی انہونی نہیں۔ قادرِ مطلق ہم جیسے کم مایہ اور بے بضاعت اور کمزور عزم وارادے والے آدمیوں کو اپنی پناہ میں رکھے، مگر تاریخ کے مطالعے سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اخلاقی اور روحانی اصلاح یا دوسرے لفظوں میں انسانوں کو حیوانیت کی پست سطح سے اٹھا کر انسانیت کی اصلی سطح پر لے آنا دنیا کا سب سے مشکل، سب سے زیادہ صبر آزما اور سب سے زیادہ محنت طلب کام ہے۔ اس راہ میں انسانیت کے بہی خواہوں نے گالیاں کھائیں، قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، گھر بار لٹایا اور بعض حالات میں بڑی اذیت کے ساتھ جانیں بھی قربان کیں۔ جو فرد یا گروہ انسانیت کے حقیقی مقام کو کھو دیتا ہے اس کے لیے پھر کوئی بُرائی بُرائی نہیں رہتی۔ وہ انسانیت کے اصلی بہی خواہوں کو ہر طرح سے ستاتا اور پریشان کرتا ہے۔ جو شخص حق وصداقت کی راہ چھوڑ کر اپنی ہی دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے اس سے کسی دوسرے شخص کی عزت وآبرو اور جان ومال کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اس وقت جماعت اسلامی کے خلاف جس قسم کی الزام تراشیاں اور دست درازیاں ہو رہی ہیں وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنے کا بالکل فطری ردِ عمل ہے جس پر ہمیں کبھی برافروختہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو اشخاص ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ان کے حق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی اسی اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ دُعا کرنی چاہیے جو ہمیں حضور سرورِ کائنات دو عالم کی اس دُعا میں ملتی ہے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو معاف فرمائیے کیونکہ وہ جانتے نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر مغفرت کے بجائے قادرِ مطلق سے قوم کے لیے ہدایت کی استدعا کی گئی ہے۔

"قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفاء میں اس دُعا کے کئی ایک مُضمرات بیان کیے ہیں یہ دعا حضور سرورِ کائنات ؐ کی نوعِ انسانی سے غایت درجہ محبت اور گم کردہ راہ لوگوں کے لیے ہدایت کی گہری آرزو اور تمنا کی آئینہ دار ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حلم اور صبر کے مقدس جذبات جھلکتے ہیں اور اپنے مخالفین کے خلاف کینہ، بغض اور عداوت کی جگہ بے مثال رحم اور شفقت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اور پھر انہیں اللہ کے غضب سے بچانے کے لیے خود اُن کی طرف سے یہ عذر بھی بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ حقیقتِ حال سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی ناپسندیدہ حرکات کر رہے ہیں، اس لیے انہیں معاف کر دیا جائے۔

عفو و درگزر، صبر و تحمّل اور بردُباری جیسی اعلیٰ صفات جس تناسب سے ہم اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اسی نسبت سے ہم دنیا میں فائزالمرام اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہمارے خلاف جھوٹ کا طوفان اٹھایا جاتا ہے اور طرح طرح کی غلط باتیں ہماری طرف منسوب کر کے ہمیں رُسوا و بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ہمارے اندر جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مگر ہمیں ان بے ہودگیوں پر صبر کر کے اجر کی امید رکھنی چاہیے اور اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ قدرت کا یہ نظام یونہی کسی اندھی قوت کے اشارے پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اسے ایک ایسی بصیر و خبیر اور عادل و صاحبِ اختیار ہستی چلا رہی ہے جو نہ صرف ہر قسم کی زیادتیوں کو اچھی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانتی ہے بلکہ انصاف کرنے اور ظالم کو سزا دینے کی بھی پوری پوری قوت رکھتی ہے۔

ہم اپنے رفقاء کو اس مرحلے پر قرآن مجید کی یہ آیت پیش نگاہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (طٰہٰ، ۱۳۰)

صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

صبر کے لغوی معنی رہ کنے اور سہنے کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے رکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ صبر کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں۔ اشتعال انگیز حالات میں قوت و طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بے قابو نہ ہونے دینا صبر ہے۔ مخالفین کی زیادتیوں اور اتہام تراشیوں کو سکونِ خاطر کے ساتھ نظرانداز کر دینا صبر ہے۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ (مزمل-۱۰)

ان کی باتوں پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔

صبر راہِ خدا میں جدوجہد کے لیے ایک لازمی صفت ہے۔ دنیا میں آج تک بھلائی کی اشاعت اور اس کے نفاذ کو کبھی بھی دنیوی مفاد کے پرستاروں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ بگاڑ کے علمبرداروں نے اس کی ہمیشہ پوری شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے اور جو لوگ اس راہ میں نکلے ہیں اُن پر ہر قسم کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ ان حالات میں اگر اہلِ خیر صبر کا دامن چھوڑ دیں تو وہ اپنے مقدس مشن کی تکمیل نہیں کر سکتے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ، اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ

جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے اس پر کوئی گرفت نہیں۔ گرفت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ ۴۲-۴۳)

ایسے ہی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

اللہ کے دین کی سربلندی کا کام کوئی پھولوں کی سیج نہیں جسے کوئی فرد یا گروہ کوئی تکلیف اٹھائے بغیر سرانجام دے سکے۔ جب کوئی شخص نیکی کا حکم دیتا ہے تو منکرات کے سارے ایوانوں میں دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب مل کر حق کے خلاف یلغار کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص برائی سے روکتا ہے تو برائیوں کا ارتکاب کرنے والے اسے اپنے خلاف ایک خوفناک چیلنج سمجھ کر اس کے مقابلے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے وقت مختلف قسم کے مصائب کا پیش آنا بالکل فطری امر ہے اور انہیں ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرنا بھی دینِ حق کا ایک تقاضا ہے۔

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس پر صبر کر، یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔

قرآن مجید نے راہِ خدا میں نکلنے والوں کے لیے اخلاص، توجہ الی اللہ، صبر و ثبات کی جو بار بار تلقین کی ہے اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مگر اس کی دوسری وجہ انسانی فطرت کی ایک بہت بڑی کمزوری کے بارے میں احساس دلانا ہے۔ انسان جب کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ اس کے ثمرات کو وہ جلد ہی اپنی جھولی میں ڈال لے۔ مگر جب اسے اس صبر آزما اور مشکل کام میں بظاہر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ بسا اوقات کسی سستے نسخے کو آزما کر کامیابی سے ہمکنار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ بے صبری اس سے ایسے غلط کام کروا ڈالتی ہے جو اصل مقصد کے منافی بھی ہوتے ہیں اور اس کے لیے نقصان دہ بھی۔ قرآن مجید نے اسی لیے صبر کی تلقین کے ساتھ جلد بازی سے روکا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ (احقاف: ۳۵)

پس صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور مخالفوں کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔

مقصد اور ذرائع کے باہمی تعلق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقدس مقاصد مقدس ذرائع کی مدد ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مقصد تو نیک ہو مگر حاصل اُسے ناپاک ذرائع سے کیا جائے۔ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد للہیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ذرائع ناپاک ہوں تو ممکن ہے کہ انسان دنیوی اعتبار سے بظاہر کامیاب ہوتا نظر آئے، مگر دینی اعتبار سے ناکام ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی کامیابی کا دارومدار ظاہری کامیابی پر نہیں بلکہ خلوص نیت، راست بازی اور اللہ کی رضا پر ہے۔ اگر اس نے کامیابی کی بے جا خواہش اور تمنا میں اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دیا تو وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام و نامراد رہا۔ لیکن اگر اُس نے اس جدوجہد میں حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑا اور مشکلات و مصائب کے باوجود جادۂ مستقیم پر گامزن رہا تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہی ہے، چاہے ظاہر بین آنکھوں کی نظر میں وہ ناکام ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف مختلف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۳۳)

اور اس سے زیادہ اچھی بات اور کس کی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور خود نیک کرداری اختیار کی اور کہا کہ مَیں اللہ کے فرماں برداروں میں سے ہوں۔

یعنی سب سے اچھی بات اُس بندۂ خدا کی ہے جو ایمان و عمل کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے بندوں کو بھی اُس کی طرف بلاتا ہے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور اس راہ میں جان کھپاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اسی بات کی متقاضی ہے کہ داعی کے اپنے اعمال نیک ہوں اور وہ خود اپنے مالک وخالق کا فرماں بردار بندہ ہو کیونکہ اگر اس کی اپنی زندگی اطاعتِ الٰہی سے مزین نہ ہوگی تو اس کی دعوت الی الخیر میں کیا اثر ہوگا؟

مقصد کی پاکی کے ساتھ ذرائع کی پاکی اسلام کا ایک ایسا تابناک اور امتیازی پہلو ہے جو ایک مسلمان کی جدوجہد کو اوّل سے لے کر آخر تک روحانیت کے نور سے منور کر دیتا ہے۔ یورپ کے حکماء نے اہلِ یورپ کو جو فلسفۂ اخلاق دیا ہے اُس کی رُو سے مقصد اور ذریعہ کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ انہیں مادّی فلسفۂ حیات نے یہ تعلیم دی ہے کہ اصل چیز مقصد کا حصول ہے اور اسے جائز و ناجائز جس طریقے سے بھی حاصل کیا جاسکے، حاصل کر لینا چاہیے۔ اس فلسفے کو پوری قوت کے ساتھ یورپ کے بہت سے مفکرین نے پیش کیا ہے، جن میں میکیاولی سرِ فہرست ہے۔ اس شخص نے اس باطل فلسفہ کا پرچار کر کے یورپ کے اخلاق کو جس طرح بگاڑا ہے اس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اسی باطل پرست "فلارنساوی حکیم" کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ حیلہ بازی، موقع پرستی، مکروفریب سب کو سندِ جواز مل گئی ہے، جھوٹ اور سچ کو ایک ہی مقام پر لاکھڑا کر دیا گیا ہے اور اس فلسفے کی وجہ سے سیاست کے اندر غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی حرکات کا عام چلن ہوا ہے۔

اسلام کا اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ کوئی مقصد جس ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ ذریعہ خود اس مقصد کا ایک حصّہ ہے۔ اسلام نے اپنی مقدس منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ اور انداز تجویز کیا ہے وہ خود بھی اتنا ہی مقدس اور پاکیزہ ہے جتنی کہ خود منزل۔ کیونکہ اسلام کے پیش نظر یہ بنیادی حقیقت بھی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ جس راہ سے، فکر و احساس کے جس جذبے اور جس حوصلے اور نیت اور عزم کے ساتھ کسی منزل کی طرف بڑھتا ہے، اُن سب کا منزل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسلام اس بات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصولاً غلط اور فطرت کے منافی سمجھتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ غیر اخلاقی حرکات کی مدد سے کوئی بلند اخلاقی اور روحانی نصب العین حاصل کر سکے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے:

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ (رعد: ۲۲)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی خاطر صبر کیا اور نماز قائم کی اور جو رزق ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور جو برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

یہ آیت مقصد اور ذریعہ کے باہمی تعلق اور ان دونوں کی تقدیس پر نہایت واضح الفاظ میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے خدا کے مخلص بندے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور اس راہ میں ثابت قدم رہ کر جدوجہد کرتا ہے اور جو مصائب اُسے پیش آئیں انہیں صبر کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔ اس مقدس جدوجہد کو کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کے لیے سب سے اہم فرض نماز ہے۔ نماز کے ذریعے ہی اپنے رب کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے دل سے حرص، لالچ، بخل اور دنیوی مال و متاع کی محبت نکال کر اس کے اندر اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اس عمل سے اُسے راہِ خدا میں خلوصِ نیت کے ساتھ ایثار کرنے کی تربیت ملتی ہے۔ اور اسی ضمن میں آخری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ایک مومنِ صادق برائی کو نیکی سے دفع کرتا ہے۔ برائی کا مٹانا ایک بھلائی کا کام ہے۔ خدا کا بندہ اس بھلائی کے کام کو بھلائی ہی سے سرانجام دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس بھلائی کے کام کو برائی کے ساتھ سرانجام دے تو اس کے مقدس مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اِس آیت کا آخری جملہ "ان کے لیے آخرت کا انجام ہے" بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں خواہ مومن کو کامیابی نصیب نہ ہو مگر آخرت کی کامیابی جو درحقیقت اس کی جدوجہد کی غایتِ اُولیٰ ہے وہ اُسے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مومن کا مطلوب و مقصود جب رضائے الٰہی ہے جو سچے اور گہرے ایمان و ایقان اور پاکیزہ اعمال ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، تو خدا کا مخلص بندہ اس کے حصول کے لیے آخر ناپسندیدہ ذرائع کے استعمال کے بارے میں کس طرح سوچ سکتا ہے؟

ایک مسلمان کے لیے سیاسی جدوجہد، معاشی تگ و دو، معاشرتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش اور علم کے حصول کے لیے محنت، کوئی ایک کام بھی منتہائے مقصود نہیں بلکہ یہ سارے کام رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس بنا پر ان سارے کاموں کو اسی احساسِ ذمہ داری اور خلوصِ نیت سے ادا کرنا چاہیے جس طرح کہ ایک انسان دینی فریضے کو ادا کرتا ہے۔ سیاسی جدوجہد سے اس کا مقصد اپنی قوم یا اپنے ملک یا اپنے قبیلے یا خود اپنی ذات کی سربلندی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے پیچھے اللہ کے دین کو دنیا میں سربلند اور غالب کرنے کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اسی طرح معاشی تگ و دو سے اس کا مقصود اپنی ذات یا برادری کے لیے زیادہ سے زیادہ معاشی منافع سمیٹنے کے بجائے انھیں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سچی اور گہری آرزو ہونی چاہیے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں یوں فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔	کہہ دو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔

(انعام: ۱۶۲)

یہ ہے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ایک مومن کی زندگی کا مقصد اور اس کا صحیح طرزِ عمل۔ اس کی عبادت اور مذہبی اعمال، اس کی زندگی اور اس کی موت سب کا منتہائے مقصود خدا کی خوشنودی ہونی چاہیے۔ اس بنا پر وہ سارے ذرائع جن کی مدد سے ایک مسلمان اس مقصود کو حاصل کرتا ہے وہ بھی بندگیٔ رب میں شامل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغرب میں مقصد اور ذریعہ کو الگ الگ سمجھنے کا جو غلط تصوّر رائج ہے اس کی بنیاد دین و دنیا کی وہ تفریق ہے جس کی ابتدا کلیسا نے کی اور جسے بعد میں مغرب کے مادہ پرست مفکّرین نے قوت بہم پہنچائی۔ مگر یہ مفکّرین اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ جس نصب العین کو مقدس سمجھا جاتا ہے وہ خود دوسرے بہت سے مقاصد سے عبارت ہوتا ہے جس میں ذرائع بھی شامل ہوتے ہیں۔ فکری اور نظری اعتبار سے ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق کی جا سکے مگر عملی جدوجہد میں مقصد اور ذریعہ کے درمیان امتیاز نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ اس طرح کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنے لیے بہت سی الجھنیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کے لیے یوں تو کئی ایک مثالیں دی جا سکتی ہیں، مگر میں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ اسلام کے نظامِ عبادات پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پانچوں فرائض ذرائع اور مقاصد دونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب ہم زندگی کا اصل مقصود رضائے الٰہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ مذہبی فریضے اُسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر جب فرائض کی ادائیگی کو مقصدِ حیات ٹھیراتے ہیں تو جن وسائل سے ہم یہ فرائض سرانجام دیتے ہیں ان کی حیثیت ذرائع کی بن جاتی ہے۔ مثلاً حج رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ بھی ہے، مگر یہی فریضہ جب مقصد بنتا ہے تو مال و دولت ذریعہ بن جاتی ہے جس کی مدد سے اس فرض کو سرانجام دیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سیاسی جدوجہد کی مختلف کڑیاں ایک نقطۂ نظر سے مقاصد اور دوسرے نقطۂ نظر سے ذرائع کی حیثیت اختیار کر سکتی ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں اللہ کے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو سیاست کی حیثیت ذریعہ کی سی ہوتی ہے کیونکہ سیاسی قوت اس عظیم مقصد کی تکمیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے جب اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں میں ڈھالنے کے لیے سیاسی جدوجہد کی جاتی ہے تو یہ فرض بذاتِ خود مقصد دکھائی دینے لگتا ہے اور انتخابات میں کامیابی کے لیے سعی و جہد، رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے تگ و دو، یہ سب کام ذرائع کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ غالباً اسی بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض لوگ جماعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی کی سیاسی جدوجہد اور اس کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، اور اسے ایک سیاسی جماعت کہہ کر اس کے دینی مرتبہ و مقام کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام نے جب مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھی تو ہم آخر یہ جسارت کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ جن کاموں کو دنیا غیر مذہبی کام سمجھتی ہے ان کو اس نے مذہب کے تابع کر کے اور انہیں اخلاقی حدود کا پابند بنا کر اور ان کے اندر روحانیت کا نور بھر کر حیاتِ انسانی کو ایک فطری وحدت عطا کی ہے۔ یہ وحدت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر گام اور ہر قدم پر دینی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کیا جائے۔

فَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَلَہٗٓ اَسْلِمُوْا (الحج ۳۴) — پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے لہٰذا اسی کے تم فرمانبردار بنو۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے جماعت کے رفقاء کو جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان کا زیادہ تر تعلق قلب و دماغ سے ہے۔ یہاں ہم چند باتیں عملی جدوجہد کے سلسلے میں بھی ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تدبر ہے یعنی انہیں ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ ان کی جدوجہد زیادہ سے زیادہ بہتر نتائج پیدا کر سکے اور ان کی محنت کا کسی طور بھی زیاں نہ ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرے کے اجزائے ترکیبی اور اس کے مختلف طبقات کے احساسات و رجحانات سے پوری طرح واقف ہوں تاکہ ہر طبقے تک اپنی دعوت بڑی کامیابی کے ساتھ پہنچا سکیں۔ معاشرے کے جو نفسیاتی تجربے کیے گئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ایک انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ عموماً ایک معاشرے میں پانچ فیصد ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو حق و صداقت کی آواز سنتے ہی اس پر دل و جان سے لبیک کہتے ہیں اور پھر اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ ۵ فیصد طبقہ بڑے ٹیڑھے دماغ کا مالک ہوتا ہے اور کوئی صحیح بات اس کے دماغ میں اترتی ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں سکتی ۔ یہ طبقہ ہر صحیح چیز کی مخالفت کرتا ہے ۔ معاشرے کے باقی نوے فیصد افراد پر "خاموش اکثریت" (SILENT MAJORITY) کا اطلاق ہوتا ہے جس کی حیثیت خاموش تماشائی کی سی ہوتی ہے ۔ اگر حق و صداقت منظم ہو کر قوت حاصل کرلے تو یہ طبقہ اس کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے اور اگر باطل غالب قوت بن جائے تو یہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگ جاتا ہے ۔

پھر اس "خاموش اکثریت" میں بھی کئی طبقے پائے جاتے ہیں مگر بہت بڑا طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں دنیوی مفادات سب سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ دراصل دنیوی مال و متاع کی پرستش کرتے ہیں اور جس طرف انہیں یہ زیادہ مقدار میں حاصل ہوتا نظر آئے اس کی طرف جھک جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض افراد بڑے شد و مد کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی اخلاقی اقدار سے یکسر عاری ہوتی ہے ۔ تاہم اس خاموش اکثریت میں ایک معقول تعداد ان افراد کی بھی پائی جاتی ہے جو محض غلط فہمی کی بنا پر حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور اگر صحیح بات ان کی سمجھ میں آجائے تو پھر وہ نہ صرف مخالفت سے باز آجاتے ہیں بلکہ حق کے علمبرداروں کا ساتھ دینے کے لیے بھی تیار رہو جاتے ہیں ۔

ہمارے رفقاء کو دعوتِ دین کے معاملے میں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی بات زیادہ مؤثر انداز میں معاشرے کے اُس پانچ فیصد طبقہ تک پہنچائیں جو حق و صداقت کی حمایت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور جب بھی کسی طرف سے کوئی بھلائی کی آواز بلند ہو تو آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتا ہے ۔ اس ذیل میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر ہم اس طبقے کو کس طرح پہچانیں ؟ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے ۔ چند صفات ایسی ہیں جن سے یہ طبقہ بڑی آسانی کے ساتھ پہچانا جاسکتا ہے ۔

(۱) اس طبقے کے افراد کو دنیوی مال و متاع سے کوئی زیادہ محبت نہیں ہوتی اور وہ اصولوں کی خاطر اپنے مفاد کو بڑی آسانی کے ساتھ قربان کرسکتا ہے ۔ اسے مال و اسباب اور (باقی ص ۶۲ پر)

© rasailojaraid.com